اصول تفسیر

مولانا نائیس احمد جارچوی

قرآن اللہ کی مقدس کتاب ہے اور دنیائے بشریت کے لئے اعلیٰ ترین دستور حیات ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے انسان اگر اپنی تمام فکری توانائیوں کو بھی بروئے کار لے آئے، تب بھی اس کا سمجھنا آسان نہ ہوگا۔ صدیوں سے قرآن اس کی آیتوں کی گوناگوں تفسیریں لکھی جارہی ہیں، مگر ہنوز اذہان قاصر اور فکریں سربہ گریباں ہیں۔ قرآن فہمی ایک مشکل کام ہے۔ مگر ناممکن بھی نہیں ہے، البتہ اس کے لئے کچھ اصول درکار ہیں۔ الفاظ قرآن کے ساتھ ساتھ اس کی تہوں تک پہونچنا اور مضمون کی گہرائی میں اترنا قاری کے لئے اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ کتاب صرف پڑھنے کے لئے نہیں نازل کی گئی ہے، بلکہ اس کو مکمل لائحہ عمل کی حیثیت سے اتارا گیا ہے۔ اس لئے اس کا سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ بغیر سمجھے ہوئے اس کی تعلیمات پر عمل ممکن نہیں ہے۔

قرآن فہمی:

قرآن فہمی ایک مستقل موضوع ہے۔ اس کے لئے کچھ اصول وضوابط بھی ہیں۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے حالانکہ عربوں کے لئے بھی اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے تو غیر عرب کے لئے کافی حد تک یہ دشوار گذار مسئلہ ہے۔ اگر عربوں کے لئے قرآن سمجھنا آسان ہوتا تو اصحاب رسول آیتوں کے نزول پر حضورؐ سے ان کی تشریح طلب نہ کرتے۔ لہٰذا عرب اور غیر عرب سبھی کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کی آیتوں کی تشریح اور شان نزول سے واقف ہوں۔ صاحبان قرآن اور مفہوم قرآن سے شناسائی ہو۔ اس کے لئے جو اصول مرتب کئے گئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعہ

یعنی آیتوں سے آیتوں کی تفسیر ہونا چاہئے، کیونکہ ایک حکم ایک آیت میں مجمل ہے تو دوسری آیت میں کسی قدر مفصل ہے یا کوئی حکم ایک یا دو تین آیتوں میں مکمل طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے جب ان آیتوں کو سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے تو اصل حکم واضح ہوجاتا ہے۔ کیونکہ قرآن کی بعض آیتیں بعض آیتوں کی تفسیر کرتی ہیں۔ اس طریقۂ تفسیر کو علماء نے پسند بھی کیا ہے اور اس پر عامل بھی

رہے ہیں۔تفسیر کے لئے یہ بہترین طریقہ ہے ۔ابن کثیر کا نظریہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ وہ خطبۂ کتاب جو اصل میں مقدمہ تفسیر ابن کثیر ہے، میں فرماتے ہیں'' تفسیر کا بہترین اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ اول تو قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے ہو،اس لئے کہ ایک بیان کہیں مختصر ہے تو کہیں اس کی تفصیل بھی ہے۔(تفسیر ابن کثیر ج ۱ صفحہ ۱۴۱)

قرآن مقدس چونکہ اجمال اور تفصیل دو متضاد صفتیں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، اس لئے اس کے اجمال کو خود اسی سے سمجھنا زیادہ مفید ہے اور اس کی تفصیل کو آیتوں کی گہرائی میں دیکھنا ضروری ہے، ورنہ لغزش کے امکان کہیں نہ کہیں رہ جائیں گے۔اس باب میں ہم دو آیتیں پیش کرتے ہیں جن سے موضوع بحث کو سمجھنے میں ضروری مدد ملے گی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمْ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (سورہ بقرہ ۱۲۹)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار مبعوث فرما ان میں انہیں میں سے ایک رسول کہ جو ان پر تیری آیتوں کی تلاوت کرتا ہو اور انہیں تعلیم دیتا ہو کتاب وحکمت کی اور ان کے نفسوں کو پاکیزہ بنائے کہ بیشک تو غالب حکمت والا ہے۔

مذکورہ آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا نقل کی گئی ہے جو آپ نے حضرت اسماعیلؑ کی ذریت کے لئے فرمائی۔ یہ ایک آیت ہے جس کی تفسیر جب ہم قرآن میں تلاش کرتے ہیں تو بالکل اسی لہجہ اور انداز کی آیت سورہ جمعہ میں بھی موجود ہے اس کے الفاظ ذرا سی تقدیم وتاخیر کے ساتھ تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے اس آیت کے ہیں۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمْ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (سورہ جمعہ ۲)

ترجمہ: وہی تو ہے کہ جس نے مبعوث فرمایا امین میں انہیں میں سے ایک رسول جو ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب وحکمت کی۔ جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

پہلی آیت میں'' ربنا '' ہے یعنی اے ہمارے پروردگار جو تضرع کے ساتھ ایک دعا کو ظاہر کرتا ہے جو یقیناً ایک بندہ کی طرف سے ہے اور دوسری آیت میں'' ھو الذی' ہے وہ وہ ہے کہ

یاوہی تو وہ ہے کہ جس نے ایک رسول مبعوث فرمایا یہاں ''ھو الذی '' سے ثابت ہوتا ہے کہ کہ خدا خود اپنے لئے فرمارہا ہے کیوں کہ رسول کا بھیجنے والا وہ خود ہے تو معلوم ہوا کہ ربنا کا اصل خطاب کوئی مجازی نہیں ہے بلکہ اللہ ہے۔

ایک مفسر جب تفسیر کرے گا تو دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر جب نتیجہ اخذ کرے گا تو وہ اس طرح ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی، ایک ایسے رسول کی بعثت کے لئے جو اہل مکہ میں سے ہو اور اہل مکہ کو الٰہی آیتوں کے ذریعہ ہدایت دے اور گناہ کی آلودگیوں سے انہیں پاک کردے خدا نے دعائے حضرت ابراہیمؑ کو قبول فرمایا اور محمد مصطفیٰ کی شکل میں وہ رسول مبعوث فرمایا۔ یہ ہے تفسیر قرآن کے لئے وہ طریقہ کہ جس طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے۔تفسیر قرآن قرآن سے کی جائے ایک آیت کی تفسیر دوسری ایک یا کئی آیتوں سے کی جائے۔مگر یہ طریقۂ تفسیر کسی قدر دشوار ضرور ہے۔اس لئے کہ ہر ایک کی تفسیر اس طور پر ناممکن تو نہیں مگر بہرحال ایک مشکل امر ہے، الفاظ قرآن اور معانی قرآن اور الفاظ کے استعمال اور قرآن پر مفسر کی گہری نظر اور ہمہ دانی ضروری ہے۔

اسی طرز تفسیر کو بعض حضرات نے تفسیر موضوعی'' کا نام دیا ہے حالانکہ یہ کام ایک موضوع سے متعلق یکے بعد دیگرے آیتوں کا جمع کردینا ہے۔بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔لیکن یکے بعد دیگر آیتوں کا لکھ دینا تفسیر اس لئے مان لیا جائیگا کہ ایک آیت خود دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے خواہ باعتبار الفاظ ہوخواہ یا معانی ہو۔

قرآن کی آیتوں سے آیتوں کی تفسیر مشکل امر ضرور ہے مگر معتبر ترین ذریعہ تفہیم ہے۔ قرآن فہمی کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ اور طریقہ نہیں ہے چنانچہ مولانا محمد تقی عثمانی معارف القرآن کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔''علم تفسیر کا پہلا مأخذ خود قرآن کریم ہی ہے چنانچہ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی آیت مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کردیتی ہے''(معارف القرآن ج ۱ ص ۳۱'')

جس طرح وضو کہ اس میں ایک اختلافی صورت نہ جانے کس طرح پیدا ہوگئی حالانکہ آیۂ وضو میں قطعی واضح حکم پایا جاتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاَةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُئُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (مائدہ آیت ۶)

اے ایمان والو ! تم کھڑے ہونماز کے لئے تو تم دھوؤ اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک اورتم مسح کرو اپنے سروں پر اور کعبین تک پیروپر۔

اس واضح ترین حکم میں اگر کوئی اجمالی مان بھی لیا جائے تو اس کی تفصیل آیت تیمّم سے مل جاتی ہے اورمسح کے صحیح معنی متعین ہوجاتے ہیں اور اس طرح کہ

فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ (سورہ نساء آیت ۴۳)

پس اگر تمہیں پانی نہ مل سکے تو تیمّم کرلو پاک مٹی سے اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر۔

یہاں مسح کے معنی بالکل واضح ہیں چنانچہ اہل اسلام تیمّم کرتے ہیں تو مسح کرتے ہیں یعنی چھوتے ہی ہیں۔ اس کی تفسیر سبھی نے اسی طرح کی ہے۔

بیشتر مفسرین کے یہاں تفسیر میں یہی لحاظ رکھا گیا ہے کہ آیت کی تفسیر آیت کے ذریعہ کی گئی ہے اس سے دو فائدے ہوتے ہیں۔۱۔ قاری مطمئن ہوجاتا ہے۔ ۲۔ خودمفسر پر تفسیر بالرای کاالزام نہیں آتا۔

حدیث: قرآن مقدس کے اصولوں میں دوسرے نمبر پر حدیث آتی ہے یعنی اگر آیت کی تفسیر آیت سے ممکن نہ ہوتو آیت کو حدیث کی روشنی میں دیکھا جائے اور بیان حدیث سے آیت کا مفہوم اخذ کرکے تفسیر کی جائے۔ یہ اصول یقیناً اس اعتبار سے بھی بہترین ہے کہ مختلف مراحل میں آیت کی تفسیر مہیا ہوسکتی ہے۔ آیت کے نزول کے وقت صحابہ نے جس جس انداز سے آیت کے متعلق دریافت کیا ہوگا تو وحی الٰہی کی ترجمان زبان مقدس نے آیت کے متعلق سائل کی عقل کے مطابق ضرور جواب دیا ہوگا اور ایک آیت کی تشریح کئی طرح سے مل جائیگی۔ اس صورت میں حدیث کے الفاظ یقیناً قابل غور رہیں گے اورمتن حدیث کوتفسیر کی روح سمجھا جائے گا۔

قرآن مجید کی تفسیر کرنے کے لئے حدیث کا سہارا ضرور لیا جائے اسلئے کہ رسول خدا کی پوری زندگی کا معیار قرآن مجید ہے قرآن کے علاوہ رسول کی زندگی کا تصورمحال ہے اور اس کا احاطہ نا ممکن ہے آپ کی حیات طیبہ میں قرآن مقدس کا مکمل دخل ہے کوئی عمل اور کوئی فرمان ایسا نہیں جو مطابق قرآن نہ ہو، رسول خداؐ کی حیات عمل کی شکل میں قرآن ہے اور قرآن بیان کی منزل میں حیات رسول خدا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے میں دیکھا جاسکتا ہے یعنی کہ دونوں ہی ایک دوسرے کا

آئینہ ہیں۔ اس لئے حدیث کے ذریعہ بہترین تفسیر ہوسکتی ہے ۔ آیت کے معانی اور مقام ومفاہیم کی گہرائی تک رسائی ممکن ہے یہ ایک قابل عمل اور مطابق عقل سلیم، پیغامی صورت میں تفسیر ہوسکتی ہے۔ مگر یہ وادی بہت پر خار ہے یعنی حدیث سے قرآن کو سمجھنا بہت آسان ہے مگر خود حدیث کو سمجھنا اور صحیح حدیث تک رسائی انتہائی مشکل کام ہے۔ اس کے لئے دوطرح کے علم پر دسترس ضروری ہے ا۔ علم حدیث ۲۔ علم درایت۔درایت در اصل علم درایت کی بنیاد ہی حدیث ہے ۔ اگر علم حدیث کو ہٹادیا جائے تو علم درایت بے معنی ہوکے رہ جاتا ہے ، یہ علم وجود میں ہی اس لئے آیا تھا کہ حدیثوں کو پرکھا اور جانا جاسکے اوران حدیثوں روایتو کے راویوں پر نظر کی جائے ان کے حالات کو دیکھا جائے کہ ان کی رسول سے کتنی قربت رہی ہے اور کس قسم کی قربت رہی ہے اور ان کا اپنی زندگی میں معیار حیات کیا رہا ہے اگر وہ جھوٹ بولنے کے عادی رہے ہیں تو ممکن ہے اس بیان میں کہ جسے ہم حدیث کہہ رہے ہیں اس میں بھی غلط بیانی سے کام لیا ہو اور اس کی غلط نسبت پیغمبرؐ کی طرف دے دی ہو۔ یا کعب الاحبار جیسے لوگ دین میں داخل ہوگے ہوں اور ایک خاص منصوبہ کے تحت جعلی حدیثوں کا کارخانہ کھول لیا گیا ہو یا عبد اللہ ابن ابی مسعود جیسے افراد بھی ہوسکتے ہیں۔مدینہ میں جہاں نیک نفس پاک سیرت صراط مستقیم پر گامزن ایماندار صحابۂ کرام رہتے تھے وہیں ایک خاص بڑی تعداد منافقوں کی بھی تھی یہ کیسے ممکن ہے کہ ان منافقوں نے رسول خدا کے کلام میں اپنا بیان نہ ملادیا ہو جبکہ اس کے امکان اور ضرورت بالکل واضح ہے اور اس سے کسی کو انکار کی گنجائش بھی نہیں ہے۔تابعین اور تبع تابعین کی بحث تو بعد کی ہے۔

حفاظ حدیث کی کثرت کو دیکھتے ہوئے اور ان کے رسول خدا کی طرف منسوب غلط بیانی کو دیکھتے ہوئے علماء کی ایک جماعت نے یہ کام کیا کہ جو حدیث کے راوی تھے ان کے حالات جاننے شروع کئے۔جس کے نتیجہ میں کئی کتابیں تیار ہوگئیں اس کی تفصیل کے لئے اضافہ فی تمیز الصحابہ۔ تنقیح المقال اور رجال کشی ملاحظہ فرمائیں۔ ان کتابوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حدیثوں کے اعتبار سے مفید مطلب اور صحیح حدیث کو نکالنا کتنا مشکل ہے۔

علم حدیث کے لئے جہاں علم ورایت کی ضرورت ہے وہیں علم رجال بھی ضروری ہے یعنی علم حدیث کے لئے علم درایت ضروری ہے اور علم درایت کے لئے علم رجال ناگزیر ہے۔علم رجال ہی طے کرتا ہے کہ کونسی حدیث حسن ہے کونسی صحیح مؤثق اور ضعیف ہے ۔ جہاں ایک مفسر کے لئے اچھا

عربی داں ہونا ضروری ہے وہیں ان تینوں علوم میں ماہر ہونا بھی ضروری ہے۔

واضح اشارہ

ہم حدیث کی اقسام سے بحث نہیں کرتے مگر اس نکتہ پر ضرور ٹھہرنا چاہتے ہیں کہ کن لوگوں کا بیان حدیث کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ضمن میں علماء اہلسنت کا نظریہ صاف ہے کہ قول رسول، عمل رسول حدیث کہلائے گا۔ شیعی نقطہ نظر یہ ہے کہ رسول خدا، حضرت علیؑ حضرت فاطمہؑ حضرت حسنؑ حضرت حسینؑ اور حضرت حسین کے بعد جو آئمۂ اہلبیت ہیں ان کا بیان بھی حدیث کا درجہ رکھتا ہے۔

علماء اہلسنت ان کی تکذیب تو نہیں کرتے مگر ان کے بیان کو حدیث کا درجہ نہیں دیتے جبکہ بعض صحابہ کے قول وعمل کو حدیث کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس شیعہ صحابہ کے قول وعمل کو حدیث کا درجہ نہیں دیتے رسول خداؐ کے بعد آیت تطہیر میں شامل ہونے کی بنا پر ائمہ اہلبیتؑ کے بیان کو حدیث کا درجہ دیتے ہیں اور تفسیر قرآن کرتے ہوئے رسول خدا اور ائمہ اہلبیتؑ کے بیانات کو مقدم جانتے ہوئے اسی کی روشنی میں تفسیر کرتے ہیں۔ چونکہ اس وقت ہمارا مقصود بیان علم کلام کی کوئی بحث چھیڑنا نہیں ہے بلکہ ہم صرف تفسیر اور تفسیر کے موضوع سے گفتگو کر رہے ہیں کہ قرآن کے بعد حدیث ہی قرآن مجید کی تفسیر کے لئے بہترین مأخذ ہے مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا بے حد ضروری ہے کہ جس حدیث کی روشنی میں تفسیر کی جارہی ہے وہ حدیث خود حدیث کی کس قسم میں داخل ہے اور اس کے راویوں کا سلسلہ کیسا ہے۔ آیا راویوں کا سلسلہ مکمل ہے کہ نہیں یا سلسلۂ رواۃ تو مکمل ہے مگر اس میں ایک یا ایک سے زاید راوی مجہول غیر معروف یا کاذب ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ان کی بیان کردہ روایتوں پر بھروسہ کرکے تفسیر میں لغزش کے امکان بہر حال رہیں گے۔

ایک مفسر کے لئے ضروری ہے کہ تفسیر کرتے ہوئے دیانتداری کو ملحوظ رکھے اور مسلکی تعصب سے دور رہے اگر مفسر مسلکی تعصب سے گریز نہ کرے گا تو آیتوں کے مطلب کو اپنے مقصد میں ڈھالنے کی کوشش کرے گا۔ اور اس کوشش میں ضعیف حدیثوں کی بیساکھیوں پر خیالی محل تیار کرے گا اور انکے ضعف کو نظر انداز کرکے تفسیر کے بجائے جرم کا مرتکب ہوگا۔ ایسے ہی مفسروں کی تنبیہ کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد خداوندی ہے۔

هُوَ الَّذِی أَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُحْکَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْکِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِیلِهِ وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیلَهُ إِلاَّ اللّٰهُ وَالرَّاسِخُونَ فِی

الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلاَّ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ ''(آل عمران آیت ۷)

ترجمہ: "وہ وہ ہے کہ جس نے آپ پر وہ کتاب نازل کی کہ جس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری کچھ متشابہ ہیں۔ تو وہ کہ جن کے دلوں میں کجی ہے پس وہ پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس کتاب کی انہیں منشا یہ آیتوں کے، تاکہ فتنہ برپا کریں اور بے جا تاویل کریں جبکہ اسکی تاویل سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا ہے اور ان کے کہ جو علم میں راسخ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب کا سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت کوئی نہیں حاصل نہیں کرتا سوائے صاحبان عقل کے۔''

مذکورہ آیت میں واضح طور پر بتادیا گیا کہ فتنہ پرداز لوگ قرآن کے متشا بہات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور آیات کی من مانی تاویلیں کرتے ہیں اور اپنی تاویلوں میں کمزور احادیث کا سہارا لیتے ہیں اور ایسے راویوں پر بھروسہ کرتے ہیں جو خود اپنی ذاتی زندگی میں اپنے دین وعقیدے سے وفا نہیں کر سکے۔ اس طرح کے افراد تفسیر کرتے وقت خود تو اپنی علمی خیانت کے ذمہ دار ہیں ہی البتہ ان لوگوں کے عمل کے ذمہ دار بھی ہیں جو ان کی خیانت کاری کی بنا پر سوء اعمال کے شکار ہوجاتے ہیں۔

ہم پھر ایکبار اسی بات کو دہراتے ہیں اس میں شک نہیں کہ قرآن فہمی میں حدیث بہترین مددگار ہے مگر اس وادی میں قدم رکھنا اور صحیح طریقہ سے آیتوں کے مطلب تک پہونچنا بھی دشوار گزار مرحلہ ہے۔

ہماری بات کی تائید مولانا محمد تقی صاحب کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے

''مفسرین کرام نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ اور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں۔ چونکہ حدیث میں صحیح ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصولوں پر یوں نہ اترتی ہو'' (مقدمہ معارف القرآن ج ۱ ص ۳۲)

صحابہ کرام

مفسرین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے نزدیک قرآن وحدیث کے بعد صحابہ کرام کا قول وعمل تفسیر کے لئے حجت ہے۔ حالانکہ یہ بات محل نظر اس لئے بھی ہے کہ کیا صحابہ کرام کا

عمل قرآن وسنت کے علاوہ بھی ہوسکتا ہے، اگر ہوسکتا ہے تو کیااس کی گنجائش ہے کہ ان کے قول وعمل کوتفسیر کا مأخذ قرار دیا جائے۔ اور اگر ان کا قول وعمل قرآن وحدیث کے دائرہ سے خارج نہیں ہوسکتا تو اس کو الگ مأخذ نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ یہ پہلے سے قرآن وحدیث کے زمرے میں شامل ہے جو رسول خدا کا قول وعمل ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ مستند معتبر اور قابل فخر صحابہ کرام کا عمل قرآن و حدیث سے ہٹ کر ہوگا۔ اس لئے اس کو الگ سے اصول تفسیر کے طور پر قرار نہیں دیا جانا چاہئے ۔ اور جب صحابہ کرام کے عمل کواصول تفسیر کی بنیادنہیں قرار دیا جاسکتا ہے تو تابعین اور تبع تابعین کے قول وعمل پر کیا بحث کی جاسکتی ہے۔ حالانکہ اس بحث کو اتقان کی دوسری جلد میں چھیڑا گیا ہے۔

عقل

البتہ قرآن فہمی میں قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ عقل کو بڑا دخل ہے۔ یہاں عقلمندی سے کام لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقل کو بنیاد بنا کے قرآن وحدیث کو پس انداز کر دیاجائے اس کے بیان کردہ احکام کونظر انداز کردیا جائے بلکہ یہاں عقل کے معنی وہی ہیں کہ جو حضرت علیؑ کے بیان کا مقصد ہیں یعنی آپ کا فرمان'' العقل ما عبد به الرحمن '' عقل کہ جس سے رحمٰن کی عبادت کی جائے یا یہ عقل وہی کہ جس سے خدائے رحمان کی عبادت کی گئی۔ اس کے عرفان کے ساتھ ۔تو اس عقل میں یقیناً وہ سکت ہوگی کہ قرآن کے مقصد سمجھ بھی سکے اور سمجھا بھی سکے۔ خود قرآن مقدس نے بھی محکم اور متشابہ آیتوں کے بیان میں صاحبان عقل پر یہی بات کو تمام کیا '' وَمَا يَذَّكَّرُ إِلاَّ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ'' (آل عمران ۷) کہ نصیحت عقلمندوں کے علاوہ کوئی نہیں پکڑتا۔ قرآن مقدس میں خدا انہیں کو اولوا الباب فرمارہا ہے کہ جن عقلوں میں خدا کا نور اور دین کی جلوہ گری ہے۔ جب ایسے لوگ قرآن کی تفسیر کریں گے تو آیتوں اور حدیثوں سے استنباط کرکے ان حقائق کو سامنے لائیں گے جن سے دین کی راہیں واضح اور صالح معاشرے کی بنیادیں مضبوط ہوجائیں۔

اگر قرآن کو بغور پڑھا جائے تو انداز ہ ہوتا ہے کہ قرآن نے اپنا مخاطب اصلی صاحبان عقل ہی کو قرار دیا ہے اور انہیں سے بار بار خطاب فرمایا ہے کہ قرآن میں غوروفکر کریں، تدبر سے کام لیں لہٰذا قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی تفسیر کا مأخذ قرار دیا جائے۔ جسم بشر میں اعلیٰ ترین خلقت عقل ہے۔ اور اسی کے سبب انسان اشرف المخلوقات قرار پایا ہے۔

لغت

قرآن چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے ایک مفسر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس زبان ولغت سے واقف ہی نہ ہو بلکہ کسی حد تک دسترس بھی رکھتا ہو اس کے محاورے اور نحو وصرف سے بھی واقف ہو تبھی الفاظ کی تہوں میں چھپے ہوئے معانی کے گوہر آبدار برآمد کرسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عربی زبان کی وسعت اور اس کے تہہ در تہہ مضمون کی نزاکتوں کو مختلف معانی کے پیش نظر جانتا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن مقدس اپنے الفاظ کے ذریعہ بھی سمجھنے والی کتاب ہے اور اپنے مفہوم کے ذریعہ بھی پیغام دینے والی کتاب بھی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مقدس کی اپنی مخصوص اصطلاحی زبان ہے۔ اس کے اسلوب اور الفاظ کی نشست وبرخاست سے بھی جہاں نیا رنگ وآہنگ پیدا ہوا ہے وہیں نئے اور مخصوص مضامین بھی وجود میں آئے ہیں۔ یہ وہی زبان ہے جسے کبھی عرب نوجوان رجز میں استعمال کرتے تھے شعراء اسی کے سہارے فصیح وبلیغ شعر کہتے تھے اور اسی زبان میں مائیں اپنے بچوں کو لوریا دیتی تھیں اور اسی زبان کی آتش فشانی جنگ کے میدان میں آگ اگلتی تھی۔ اسی زبان کی مہارت کے سہارے عرب اپنی فصاحت وبلاغت پر ناز کرتے تھے مگر جب زبان اعجازی شان کے ساتھ الٰہی لب ولہجہ میں بشکل قرآن قلب مصطفیٰؐ پر اتری فصیحان عرب رنگ رہ گئے حالانکہ الفاظ وہی تھے جو عرب کی منڈیوں اور بازاروں میں بولے جاتے تھے اب انہیں الفاظ کی تہوں میں پہونچنے کے لئے یہی عرب حضورؐ سے سوال کرتے کہ حضورؐ اس کا مطلب کیا ہے۔حالانکہ یہ وہی الفاظ تھے جنہیں وبکثرت استعمال کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کونسا لفظ کن کن معنی میں مستعمل ہے مگر نزول قرآن کے بعد ان کے معنی میں ایک مخصوص اصطلاحی مزاج بھی شامل ہوگیا۔

صلوٰۃ کے معنی عربی زبان میں دعا کے ہیں مگر اسی لفظ کو قرآن میں نماز کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا یعنی یہ قرآن کی اپنی اصطلاحی زبان ہے۔ اہل لغت صلوٰۃ کے معنی دعا کے لکھتے ہیں اور قرآن ''نماز'' بیان کرتا ہے ۔ لہٰذا خالص لغت کے سہارے قرآن کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ بلکہ قرآن حکیم نے عربی زبان اور لغت کو نیا رخ دے دیا ۔ پرانے گھسے پٹے الفاظ کو نئے معنیٰ عطا کردئے ۔صلوٰۃ بمعنی نماز قرآن کی اصطلاح ہے مگر اس میں ''دعا'' کے معنی کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ نماز ایک مخصوص عبادت ہے مگر اسمیں پڑھی جانے والی عربی عبارتوں میں مکمل طور پر دعائیہ انداز میں یعنی ''صلوٰۃ''

اپنے معنی کے دائر سے خارج بھی نہیں اور قرآنی اصطلاح کی بنا پر نئے معنی بھی ظاہر ہوجاتے ہیں۔

اس لئے یہ کہاجانا کہ قرآن کی تفسیر عربی لغت کے سہارے کی جاسکتی ہے غلط ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ تفسیر میں عربی لغت دانی کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ قرآن بیان ، لغات اور اصطلاح کا معجزانہ شاہکار ہے اس لئے مفسر پر بھی یہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

دیانتداری

قرآن مقدس کی تفسیر کے چار بنیادی اصول اور مأخذ ہم اوپر بیان کرچکے اب مزید بیان کی ضرورت نہیں ہے مگر ایک ایسی چیز بھی ہے جس کے بغیر تفسیر ممکن نہیں اور اس کا تعلق علم سے کم اور عمل سے زیادہ ہے۔ اوپر بیان شدہ اصول علم کے بغیر نہیں ہوسکتے مگر خود علم تقوی کے بغیر شجر بے ثمر ہے اور ایسا چراغ ہے جس کی روشنی دھندلی ہے اور ایسا شخص ہے جس کا فائد دوسروں کو تو ہے مگر خود اس کو اپنے علم سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔علم اور خاص طور پر دین وقرآن کا علم اگر ایسے آدمی کے پاس ہو جو تقویٰ سے دور اور دنیا پرست ہوتو ایسے شخص میں دیانت داری نہیں ہوسکتی اور جس شخص میں دیانتداری نہیں ہے وہ کسی بھی وقت اپنے مفاد کی خاطر کسی بھی چیز کو بیچ سکتا ہے۔نقصان پہونچا سکتا ہے جس کا لازمی نتیجہ راہ ہدایت سے دور ہونا اور قعر مذلت میں گر جانا ہے۔خواہشات کی دلدل سے نکل آنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے آغاز میں ہی بشریت کو دونسخہ کیمیا بتائے گئے پہلا ذٰلِکَ الْکِتَاب لاَرَیْبَ فِیْہ۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرا ھدیً للمتقین ۔ یہ کتاب سراسر ہدایت ہے متقین کے لئے ۔یعنی کہ قرآن ہدایت تو کرتا ہے مگر متقی افراد کو، جن افراد میں تقویٰ پایا جاتا ہے یہ قرآن انہیں افراد کی ہدایت کرتا ہے ۔تزکیۂ نفس اور پرہیزگاری روز اول ہی سے اسلام کے منشور میں میں شامل ہے چنانچہ حضورؐ اکرم کی بعثت کے اغراض بیان کرتے ہوئے اللہ نے ایک غرض یہ بھی بیان کی۔''وَیُزَکِّیْھِم'' کہ رسول ان کا تزکیہ نفس کریں (سورہ جمعہ) اور اس مفہوم کو مکہ کی گلیوں سے باہر نکالکتے ہوئے عملی زندگی کی افادیت بیان کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا'' قد افلح من تزکیٰ'' (سورہ اعلیٰ) جس نے پاکیزگی اختیار کی وہ یقیناً فلاح پاگیا۔

اس قبیل کے جتنے بیانات ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ انسان گناہوں سے پرہیز کرے اپنے

اور دوسروں کے معاملات میں دیانتدار بن جائے اگر ایسا ہوگیا تو خدا سے بھی دیانتدار ہوجائے گا۔

لہٰذا ایک مفسر کے لئے دیانتداری اور تقویٰ اتنا ہی ضروری ہے جتان مچھلی کے لئے پانی اور چراغ روشن کرنے لئے تیل ضروری ہوتا ہے مفسر جس قدر متقی ہوگا اس قدر دیانتدار بھی ہوگا اور بے کم وکاست آیتوں کے ذیل میں انہیں روایات کونقل کرے گا جو منشائے الٰہی کے مطابق اور آیت کا مقتضیٰ ہوں اور جو انسانی برادری کے لئے مفید ترین ثابت ہوسکیں۔

چودہ سو برس سے آج تک قرآن کی مختلف تفسیریں ہوئیں اور مفسرین مختلف مسلکوں اور مزاجوں سے تعلق رکھتے تھے اور زبانیں بھی مختلف تھیں۔ ان تفسیروں کو شمار کرنا اور ان کی صحیح تعداد معین کرنا دشوار ہے۔ مگر کچھ ہی تفسیریں ایسی ہیں جو یادگار ہیں جن کا نقش کبھی دھند لایا بھی نہیں لیکن ہر بار کے مطالعہ سے نئی آب وتاب کا احساس ہوتا ہے۔ پڑھنے والا مفسر کی دیانتداری کا قائل ہوتا ہے اور اس کے حق میں دعائے خیر بھی کرتا ہے۔ اس کا سبب اس مفسر کی دیانتداری ہے، تقویٰ ہے اور قرآن کی خدمت کا جذبہ ہے۔

بعض افراد اپنے قد کی بلندی کے لئے قرآن مقدس کی تفسیر کرتے ہیں یقیناً انہیں اس کا فائدہ بھی پہونچتا ہے۔ مگر ان کا یہ کارنامہ خود انہیں کی زندگہ میں سعی لاحاصل سمجھا جانے لگتا ہے البتہ جو لوگ خدمت قرآن کو دین سمجھ کر یہ کام کرتے ہیں تو ان کی حیات میں یہ کام ہوتا ہے مگر ان کے مرنے کے بعد کارنامہ بن جاتا ہے۔

لہٰذا تفسیر قرآن کے بنیادی اصول وماٴ خذ میں تقویٰ اور دیانت کو بھی ایک بنیاد کی حیثیت سے مان لیا جانا چاہئے۔ اس طرح اصول تفسیر پانچ ہوجاتے ہیں یعنی قرآن ۲ حدیث ۳ عقل ۴۔ عربی زبان ولغت کا مکمل علم ۵ تقویٰ۔